ادراکِ زوالِ امت

جلد دوم

ادراکِ زوالِ امت

جلد دوم

راشد شاز

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۵

سالِ اشاعت ۲۰۱۱ء

© جملہ حقوق محفوظ

ISBN 978-81-87856-28-3

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ تحقیق وتنقید اور علمی مقاصد کے علاوہ اس تصنیف کا جز کسی بھی شکل میں تجارت کی غرض سے نقل کرنا ممنوع ہے، خواہ یہ طریقۂ نقل سمعی ہو یا بصری یا کسی اور سائنسی طریقۂ عمل سے اسے کسی شکل میں اسے محفوظ کیا گیا ہو، الا یہ کہ مصنف کی اجازت پیشگی حاصل کر لی گئی ہو۔

نامِ کتاب : ادراک زوالِ امت (جلد دوم)
مصنف : راشد شاز
اشاعت اول : ۲۰۱۱ء
قیمت : تین سو پچاس روپئے (Rs.350/-)
مطبع : گلوریس پرنٹرس، نئی دہلی۔۲

ناشر

ملّی پبلی کیشنز

ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Milli Times Building, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-25
Tel:. +91-11-26945499, 26946246
Fax: +91-11-26945499
Email:millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com

بسم الله الرحمٰن الرحيم

تاریخ کے ایک ایسے لمحے میں جب متوارث اسلام کا رشتہ انبیائی اسلام سے بڑی حد تک منقطع ہو چکا ہو اور صدیوں کی مسافت کے بعد ہم خود کو ایک تاریک اور بند گلی میں پاتے ہوں، ہمارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم کسی مضطربانہ اقدام کے بجائے وحی ربّانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کریں۔ مشکل یہ ہے کہ متوارث اسلام اور انبیائی اسلام کی مثال ایک عمارت کی دو علیحدہ علیحدہ منزلوں کی ہوگئی ہے۔ ان دونوں کے بیچ کوئی زینہ ہے اور نہ کوئی لفٹ۔ پھر متوارث اسلام کے شارحین کو یہ کیسے پتہ چلے کہ بالائی منزل پر انبیائی اسلام کی شکل وصورت کتنی مختلف ہے۔ اس کتاب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ انبیائی اسلام کی طرف کوئی بڑی راہداری نہ بن سکے تو کم از کم ایک چھوٹا سا روزن ہی کھول دیں۔ کیا عجب کہ آنے والے دنوں میں کسی کو باقاعدہ لفٹ نصب کرنے کی توفیق ہو اور ہم من حیث الامت پھر سے خود کو انبیائی اسلام کی آغوش میں پائیں۔

فہرست

ابتدائیہ	۹
باب اول	
الہامی تصورِ حیات کے جلو میں	۱۵
باب دوم	
قرآنی دائرہ فکر کا زوال	۱۰۵
باب سوم	
رسالہ محمدی بنام گروہی اسلام	۲۳۳
اسلام کا شیعی قالب	۲۳۷
اسلام کا اسماعیلی قالب	۲۸۶
اسلام کا سنّی قالب	۳۲۸
باب چہارم	
ربانی تصورِ حیات کی تشکیل نو	۴۴۷
خاتمہ بحث	۵۲۳

نقشہ جات اور جدولیں

۱	دنیا ظہورِ اسلام سے پہلے	۵۳۲–۵۳۳
۲	دنیا ظہورِ اسلام کے بعد	۵۳۴–۵۳۵
۳	خلفائے بنوامیہ	۵۳۶
۴	متبادل خلافتوں کا ظہور	
	یوروپ کے نقشے پر خلافت بنوامیہ (اندلس)	۱۷۰
	خلافتِ آلِ عباس اپنے ایامِ عروج میں	۱۶۱
	فاطمی خلافت اپنے ایامِ عروج میں	۱۶۳
۵	خلفائے آل عباس	۵۳۷
۶	فاطمی خلفاء	۵۳۸
۷	امارت وخلافت بنوامیہ (اندلس)	۵۳۹
۸	ابتدائے عہد کے فاطمی ائمہ	۵۴۰
۹	شیعی ائمہ کا شجرہ نسب	۵۴۱
۱۰	گروہی اسلام کا موجودہ منظر نامہ	۲۳۴
۱۱	شیعہ سنی خلفشار	۳۲۲
۱۲	دنیا کے نقشے پر متبعینِ محمدؐ	۵۴۲

ابتدائیہ

ادراک کی پہلی جلد اس سوال پر ختم ہوئی تھی کہ اسلام کی تشریح و تعبیر میں اگر عہد بہ عہد مختلف شارحین اور متکلمین کی مداخلت نہ ہوئی ہوتی تو آج اس کی واقعی تصویر کیا ہوتی؟ پہلی جلد سے دوسری جلد کی اشاعت کے دوران تاریخ کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز رہی ہے۔ آج سے کوئی دس سال پہلے جب میں جلد اول کی آخری سطریں املا کروا رہا تھا عین اسی شام ٹیلی ویژن کے پردوں پر ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی وحشت انگیز زمین بوسی اور دل گرفتہ آہ و بکا کے ہیجان انگیز مناظر نشر ہونے لگے تھے۔ گویا فہمِ زوال کے لیے درونِ امت ایک بین الاقوامی مکالمے کا وقت اچانک اختتام کو آ پہنچا تھا۔ بحران کے ان سنگین لمحات میں سنجیدہ غور و فکر اور منظّم منصوبہ بندی کے لیے وقت پھر کم پڑ گیا۔ حالات فوری اقدامات کے طالب تھے سو ایک بار پھر نفسِ مسئلہ سے بے خبری کو ہم نے دل پر پتھر رکھ کر قبول کرنے میں عافیت جانا۔ تاریخ کی اس اچانک سبک رفتاری میں ہمارے لیے ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ امت کا ضعف اور اس کا نظری و فکری زوال آج پہلے سے کہیں زیادہ ہر خاص و عام پر واضح ہے اور اس کے ازالے کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت بھی اب پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

گذشتہ چند برسوں میں روایتی اور تقلیدی طرزِ فکر پر بڑے نمایاں سوالیہ نشانات لگتے رہے ہیں۔ افسوس کہ ایسی زیادہ تر کوششیں درونِ امت تحلیل و تجزیے کے بجائے حالات کے دباؤ کے تحت کی گئی ہیں اس لیے ان میں وقتی طور پر حالات کی درستگی کا وہی روایتی مضطربانہ انداز پایا جاتا ہے۔ ہم ابھی تک کیچ آن سنڈروم (catch-on syndrome) سے آگے نہیں نکلے ہیں جہاں ترقی کے لیے یہ لازم سمجھا جاتا ہے کہ ہم سائنس و حرفت اور مدنیت کی راہ

میں اقوامِ مغرب کی اس سرعت سے تقلید ونقالی کریں کہ بالآخر ایک دن ہمارے قدم ان سے آگے نکل جائیں۔ مدنیت محرفہ (uneven development) کا وہ تصور جو ترقی کے نام پر مسلسل ماحولیات اور فطرت کی پامالی کا سبب ہوتا رہا ہے ہمارے بیشتر پالیسی سازوں کے لیے آج بھی ایک لائق تقلید ماڈل ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں عالم اسلام کے مختلف حصّوں میں سائنسی تعلیم کا خاصا رجحان پیدا ہوا ہے۔ مغربی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے کے سلسلے میں بھی غیر معمولی دلچسپی دیکھنے میں آئی ہے۔ شاید ہمارے پالیسی سازوں کے دل ودماغ پر عہدِ مامون کا دارالحکمہ اور اسی عہد کی تحریکِ ترجمہ کی رومانوی یادیں منڈلا رہی ہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جدید دانش گاہوں کے قیام اور ترجموں کی غلغلہ انگیز مہم ایک بار پھر انھیں عباسی بغداد کی جاہ وحشمت سے ہمکنار کرسکتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے معصوم خیالات خواہ کتنے ہی طرب انگیز کیوں نہ ہوں ہمیں کسی نشاۃ ثانیہ سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ آئندہ صفحات میں ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تحریک ترجمہ کی طرف تقلیدی رویّہ ہمارے لیے کم وبیش اسی بحران کا پیش خیمہ ہوگا جس سے نکلنے میں ماضی میں ہماری کئی صدیاں ضائع ہوگئی تھیں۔ جدید امریکی یا یوروپی دانش گاہوں کو جوں کا توں درآمد کر لینا بھی ہمارے مسائل کا مداوا نہیں ہوسکتا۔ مغربی طرز کی یہ دانش گاہیں جن کا ارتقاء مغرب کی ضرورت، ثقافت اور تصورِ حیات کے نتیجے میں ہوا ہے، دراصل مغربی شخصیت کی تعمیر کے لیے مؤثر اور مجرب ہیں۔ ان سے ہماری پہلو دار اور بیدار مغز شخصیت کی تعمیر کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ مغرب کے تراشیدہ دل و دماغ، منہج علمی اور ثقافت کے نتیجے میں ہمارے روایتی معاشروں میں مزید چپقلش اور مسائل پیدا ہوں گے۔ شرعی اور غیر شرعی علوم کی ثنویت کہیں بڑے فکری بحران کا باعث ہوگی اور اس دانشورانہ خانہ جنگی میں رہا سہا سماجی ڈھانچہ بھی تباہ ہوجائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علوم جدیدہ کا یہ آبشار ہمارے اندرون سے بہے۔ اس کی جڑیں ہمارے دینی تصورات میں پائی جاتی ہوں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم دین کے مروجہ فہم کو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنتِ ثابتہ مکشوفہ متواترہ کی روشنی میں تحلیل وتجزیے کا موضوع نہ بنائیں۔

غلط اقدامات خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ کیے گئے ہوں غلط نتائج ہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ عہد اموی میں تراشیدہ روایتوں پر بند باندھنے کے لیے عمر بن عبدالعزیز کو یہ ترکیب سوجھی کہ وہ روایات کا ایک جامع اور مستند مجموعہ عین سرکاری سرپرستی میں کچھ اس طرح مرتب کروادیں کہ آنے والے دنوں میں کسی کے لیے نئی تراشیدہ روایتوں کی اشاعت کا موقع نہ رہے۔ عمر بن عبدالعزیز کی اچانک موت سے یہ منصوبہ تو آگے نہ بڑھ سکا البتہ روایتوں کی ترتیب وتجمیع کے لیے ایک خلیفۂ عادل کی سند ہاتھ آگئی اور اس طرح نظری التباسات کی دھند چھٹنے کے بجائے کذاب ومفتری روایوں کے ہاتھوں مزید دبیز ہوتی گئی۔ مامون نے، جو خود اصحابِ علم وفضل میں

سے تھا، مسلمانوں کے فکری انتشار کے سدّ باب کے لیے انھیں بزور باز وعقائد کے ایک چارٹر پر متفق کرنے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں قرآن کو قدیم ماننا تعدّ دِقدماء کے سبب شرک کا باعث تھا۔ جوشِ اصلاح میں نہ جانے کتنی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں لیکن مسلمانوں کی تشتتِ فکری کا ازالہ نہ ہوسکا۔ متوکل کے عہد میں ایک بار پھر راسخ العقیدگی کی تشریح ریاست کا ایجنڈا بنی۔ ابن حنبل کی علامتی شرکت سے متوکل محی السنہ قرار پائے۔ وقتی طور پر یگانگت کا احساس عام ہوا۔ لیکن اس پورے قضیہ کے جلو میں خلیفہ کے ساتھ ساتھ شیخ الاسلام کی علامتی کرسی بھی نامحسوس طور پر قائم ہوگئی۔ اسمٰعیلی اور شیعی فکر کے بالمقابل ایک راسخ العقیدہ اسلام کی اشاعت کا خیال نظام الملک کو علوم شرعی کی دانش گاہوں کی طرف لے گیا۔ بظاہر تو نظامیہ مدرسوں کے جال نے راسخ العقیدہ سنّی فکر کی اشاعت میں بڑا مؤثر رول انجام دیا البتہ ان اقدامات سے علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کچھ اس طرح دائمی تقدس اختیار کر گئی کہ آج تک ہم اس کے پیدا کردہ سراب سے باہر نہیں آسکے ہیں۔ اسی طرح ملک الظاہر شاہ بیبرس نے، جو عین جالوت کی فیصلہ کن جنگ میں منگولوں پر اپنی فتح کے سبب ہماری ملی تاریخ میں مجاہدِ اعظم کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں، مسلمانوں کو فقہی خانہ جنگی سے نجات دلانے کے لیے بیک وقت چار مسالک کے قاضیوں کی متبادل عدالتیں قائم کر دیں۔ بیبرس کے اس اصلاحی اقدام نے وقتی طور پر مسلکی تشدد کو شاید کم کیا ہو، البتہ اس عمل نے رفتہ رفتہ ائمہ اربعہ کے خیمے کو اس قدر تقدس اور دوام عطا کر دیا کہ آنے والے دنوں میں ایک امت ہمیشہ ہمیش کے لیے چار متحارب دھڑوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ جب تک حالات کا صحیح تحلیل و تجزیہ نہ کیا جائے رفع فتنہ کی خاطر اٹھایا جانے والا ہر قدم ہمیں مزید التباسات میں الجھا دے گا۔ ہم اپنی منزل سے مزید دور ہوتے چلے جائیں گے۔

تاریخ کے ایک ایسے لمحے میں جب متوارث اسلام کا رشتہ انبیائی اسلام سے بڑی حد تک منقطع ہو چکا ہو اور صدیوں کی مسافت کے بعد ہم خود کو ایک تاریک اور بند گلی میں پاتے ہوں، ہمارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں کہ ہم کسی مضطربانہ اقدام کے بجائے وحی ربّانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کریں۔ مشکل یہ ہے کہ متوارث اسلام اور انبیائی اسلام کی مثال ایک عمارت کی دو علیحدہ علیحدہ منزلوں کی ہوگئی ہے۔ ان دونوں کے بیچ کوئی زینہ ہے اور نہ کوئی لفٹ۔ پھر متوارث اسلام کے شارحین کو یہ کیسے پتہ چلے کہ بالائی منزل پر انبیائی اسلام کی شکل وصورت کتنی مختلف ہے۔ اس کتاب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ انبیائی اسلام کی طرف کوئی بڑی راہداری نہ بن سکے تو کم از کم ایک چھوٹا سا روزن ہی کھول دیں۔ کیا عجب کہ آنے والے دنوں میں کسی کو باقاعدہ لفٹ نصب کرنے کی توفیق ہو اور ہم من حیث الامت پھر سے خود کو انبیائی اسلام کی آغوش میں پائیں۔

انسانی زندگی کے تمام بحران دراصل غلط استنباط اور غلط اقدامات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ بحران کے

مالۂ وماعلیہ کا اگر واقعی ادراک ہوتو اس کے سدّ باب کی قوانینِ فطرت میں بدرجۂ اتم گنجائش موجود ہوتی ہے۔ البتہ جو قومیں غیر روایتی اقدامات سے ڈرتی ہیں، جو ممکنہ پیش آمدہ نئی صورتِ حال سے خوف کھاتی ہیں، ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر قیمت پر تبدیلی کا راستہ روک کر بیٹھ جائیں۔ اس طرح مسائل تو حل نہیں ہوتے البتہ بحران کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مسائل سے دانستہ صرف نظری اور شتر مرغی کو شعار بنالینا دماغ کو منجمد کر دیتا ہے۔ پھر ایسی امت موت موت جینے کی کچھ اس قدر عادی ہو جاتی ہے کہ اسے زندہ زندگی کی ہر دعوت پر دشمنوں کی سازش اور شیاطین کے وساوس کا گمان ہوتا ہے۔ آخر ہم اس حقیقت سے کیسے آنکھیں بند کر سکتے ہیں کہ تبدیلی کائنات کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ خدا کی یہ کائنات مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی تجلی، ایک نئے تماشائے شوق، ایک نئے طرب اور ایک نئے احساس کا ظہور ہے۔ ہمارا رویہ خلاقانہ ہو اور ہم امینِ کائنات کی حیثیت سے اس تماشائے کن فیکون کے پسِ پردہ خدائی اسکیم کا کسی قدر ادراک رکھتے ہوں اور ہمارے احساس وادراک مسلسل اس بات کی شہادت دے رہے ہوں کہ ربنا ماخلقت هذا باطلا تو ہمیں ان تبدیلیوں سے خوف کھانے، ان کی نامانوسیت سے وحشت زدہ ہونے اور ان کا راستہ روک کر بیٹھ جانے کی چنداں ضرورت پیش نہیں آتی۔ کتابِ ھدیٰ کے حاملین کے لیے کتابِ فطرت کے طرب انگیز جلوے خوف کے بجائے خشیت کا باعث ہوتے ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کن فیکون کے رموز سے واقف یہ امت اپنی ملّی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی زندگی میں پیدا ہونے والے تغیرات سے خوف کھائے اور نئی صورت حال کے لیے نیا حل تلاش کرنے پر قادر نہ ہو۔

جس طرح کائنات مسلسل نمو اور ارتقاء کے راستے پر گامزن ہے اسی طرح کاروانِ انسانی بھی مسلسل تاریخ میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ تسخیر و اکتشاف نے انسانی زندگی کو حیرت انگیز تغیرات سے دوچار کر رکھا ہے۔ تجارت ہو یا حرفت، تعلیم ہو یا تعلم یا درس وارشاد کی مجلسیں، سفر حضر سے لے کر فضائے بسیط کی بلندیوں تک زندگی کا قالب کچھ اتنی تبدیلیوں سے گزرا ہے کہ اب موجودہ دنیا میں عدل وقسط کے قیام کے لیے روایتی فقہ کفایت نہیں کر سکتی۔ جب ہمارے پاس وحی ربّانی کا لازوال وثیقہ اپنی تمام آب وتاب کے ساتھ موجود ہو اور جس کے بارے میں ہمارا یہ یقینِ واثق ہو کہ یہ ہمارے بے سمت قافلے کو شاہراہ ہدایت پر از سرِ نو گامزن کر سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کی موجودگی میں ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کی ان فکری کاوشوں پر اصرار کریں جن پر آج صدیوں کی گرد جم چکی ہے۔

اسلام سے ہماری وفاداری اور قلبی وابستگی ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے فہمِ اسلام کو مسلسل خود احتسابی کی میزان پر رکھیں۔ اسے ہر آن قرآن مجید اور سنت ثابتہ کی روشنی میں شیقل کرتے رہیں۔ تبھی ہماری فکرِ بے نیام

میں یہ کوند پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ انسانی التباسات اور شیطانی وساوس کا پردہ چاک کر سکے۔ محض قدماء کی فکری کاوشوں اور عملی اقدامات کو خراج تحسین پیش کرنا مستقبل میں ہمارے فاتحانہ داخلے کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ بلکہ خطرہ ہے کہ اکابر پرستی کی اس بڑھتی لئے میں کسی ایماندارانہ تحلیل و تجزیہ کا امکان ہی جاتا رہے اور ہم ایک نئی ابتداء کے بجائے گردشِ محوری کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں۔ بدقسمتی سے گذشتہ کئی صدیوں سے ہم من حیث الامت قلب ونظر کی اسی خوابیدہ کیفیت میں مبتلا ہیں۔ ہماری بے سمتی اور مخمور دماغی کے چرچے عام ہیں۔ ایک نئی ابتداء کے لیے لازم ہے کہ ہمارے خوابیدہ ملی وجود کو وحی ربّانی کے راست جھٹکے لگیں۔ حالات کی سنگینی، تاریخ کا انحراف اور عمومی آہ و بکا کے اس ماحول میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ خدا کوئی پیغمبر بھیجتا۔ اب یہ ہمارا اعزاز ہے کہ آخری رسولؐ کے متبعین ہونے کے سبب کارِ نبوت کا یہ گراں بار ہمارے کمزور کاندھوں پر آپڑا ہے۔ گویا وقت آ گیا ہے کہ وحی ربّانی کے گرد تمام انسانی پہرے یکسر اٹھا دیئے جائیں۔ وحی کی نعمتِ عظمیٰ سے ہماری نسلیں بھی اسی طرح راست اکتساب کریں جس طرح مسلمانوں کی ابتدائی نسلوں نے کیا تھا۔ پھر وہی ولولہ سامانیاں اور وہی غیر متزلزل اعتماد ہمارے حصّے میں آئے جو سیادت پر فائز امتوں کا وصف ہوا کرتا ہے۔

اس کتاب کی حیثیت کسی علمی کاوش یا تحقیقی مطالعہ کی ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس حیثیت سے پڑھا جانا چاہیے۔ ہمارا مقصد ایک درونِ خانہ مکالمہ کا آغاز ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہزار سالہ انحرافات کی درستگی کے لیے لازم ہے کہ ہم ان ہمالیائی غلطیوں کا کسی قدر ادراک، اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر، اعتراف کر سکیں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم سے سرزد ہوئی ہیں اور جن پر گزرتے وقتوں کے ساتھ تقدیس و استناد کا گمان ہونے لگا ہے۔ نفسِ مسئلہ کی تفہیم کے لیے ہمیں غیر معمولی طور پر ایک بڑا کینوس تشکیل دینا پڑا ہے تاکہ ہزار سالہ التباسات کی ایک جھلک بیک نظر دکھائی دے سکے۔ ایک ایسے عہد میں جہاں تخصّصِ فن کو علمی زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے، مختلف علوم کی مدد سے ایک بڑے کینوس کی تشکیل ہوسکتا ہے بعض علمی طبائع پر گراں گزرے۔ لیکن ہماری مشکل یہ تھی کہ اتنے بڑے مسئلہ کا جب تک ایک جامع تحلیل و تجزیہ نہ ہو صورتِ حال کی واقعی تصویر کشی ممکن نہ تھی۔ یہ میری اپنی کم مائیگی تھی جو مجھے جدید سائنس سے لے کر فقہ و آثار، تاریخ و تفسیر، فلسفہ و الٰہیات، کلام و منطق، عروض و آہنگ، طب و تصوف، رمل و نجم شناسی اور نہ جانے کن کن وادیوں میں لے گئی تب کہیں جا کر یہ ممکن ہوسکا کہ میں زوالِ فکر و نظر کی اس دلخراش داستان کو کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک طائرانہ نگاہ جہاں بیک نظر زمینی حقائق کو ہمارے مشاہدہ کا حصّہ بنا دیتی ہے وہیں باریک بیں تجزیہ اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ ہم ایک ایک شئے کو جیسی کہ وہ ہے تفصیلی تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دو طریقۂ کار میں

توازن پیدا کرنے میں مجھے کہاں تک کامیابی ملی ہے البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ایک بڑا کینوس اختیار کرنے کے سبب مجھے بسا اوقات یہ احساس ہوتا رہا ہے گویا ہاتھی پورے کا پورا بیک نگاہ ہمارے تحلیل و تجزیہ کا موضوع ہو اور جہاں اس بات کا کوئی امکان نہ ہو کہ کہانی کے اندھوں کی طرح جس کے ہاتھ اس کا جو حصّہ لگے اسے ہی وہ حقیقت قرار دے ڈالے۔ ایک وسیع و عریض کینوس کا انتخاب یقیناً ایک بڑا علمی چیلنج تھا جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے میرے پاس کوئی تیاری تھی اور نہ ہی کوئی تجربہ لیکن جیسے جیسے نفسِ مسئلہ میں میری دلچسپی بڑھتی گئی میں پہلے سے کہیں زیادہ اس بات کا قائل ہوتا گیا کہ مسئلہ سے ہماری ناشناسی کا ایک سبب تحقیق و تجزیہ کا تخصیصی انداز بھی ہے جس نے ہمارے عافیت بین علماء و مفکرین کو بڑی تصویر کے ادراک سے روکے رکھا ہے۔

یہ کتاب جتنے جواب فراہم کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ سوال قائم کرنے کی موجب ہے۔ ایسا اس لیے کہ صحیح سوال قائم کرنا از خود صحیح اور صائب جواب کی طرف رہنمائی سے عبارت ہے اور اس لیے بھی کہ یہ کوئی منزل من اللہ کتاب نہیں جس پر حرفِ آخر کا گمان ہو۔ صدیوں سے بند درونِ خانہ مکالمے کے آغاز کی یہ کوشش یقیناً بعض طبائع پر گراں گزرے گی۔ بسا اوقات ہمیں ایسا محسوس ہوگا گویا متقدمین کی جلالتِ علمی اور ان کی تشریح و تعبیر شک کے دائرے میں آ گئی ہو۔ لیکن اگر مکالمے کے اعلیٰ مقاصد ہمارے پیش نظر رہیں تو ہم محض اظہارِ غیض و غضب کے بجائے اس مکالمے میں خود کو شریک و سہیم پائیں گے۔ میرے نزدیک سچ کو قبول کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ سچ ہو، خواہ سارا زمانہ اس کے خلاف گواہی دیتا ہو۔

راشد شاز

علی گڑھ، ۱۳ر فروری ۲۰۱۱ء